ڈاکٹر حافظ محمد زبیر[1]

دور حاضر میں اجتماعی اجتہاد کے محرکات

Abstract

Just like the Industrial Revolution of 17th century and the 20th century development had its global effect on world's social, economic and political paradigms, which was further supplemented by rapid growth in the technology, the religious world could also not remain unaffected. As a result, today, the religious world is exposed to such peculiar questions that it never encountered before. For example, due to industrial developments and economic changes, numerous innovative methods and forms of trade and business were introduced, and it was extremely important for the religion to be able to coop and give its opinion or to provide an alternative in case if it did not agree on certain forms. Similarly, the political revolution introduced new ideas such as democracy, elections, parliament, constitution, law and much more. This further extended to the social issues such as the parameters that one is to restrain himself to when interacting with the opposite gender, and other similar matters like free mixing between the genders, etcetera. Moreover, technological advancements raised several questions about the Shar'ī rulings of the use of certain scientific or medical inventions. Henceforth, right from the beginning of 20th century, several movements for Ijtihād began to operate.

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف ہیومینٹیز، کامسٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور

As a result of the rapid change in the global culture and civilization, scholars guided people in millions of newly raised issues which constituted thousands of volumes of Fatāwā (legal opinions) being compiled and published. This further brought forth bodies of academics to perform this process of Ijtihād in a more systematic and organized way, which laid the foundations for the institutions of Collective Ijtihād. This research study explores the main motives and causes of the movement of collective Ijtihād in the 20th Century.

دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، جس میں زندگی کے تمام گوشوں کے لیے رہتی دنیا تک رہنمائی موجود ہے۔ دین اسلام کے بنیادی مصادر قرآن وسنت ہیں۔ اگر کسی مسئلے کا صریح حل قرآن وسنت میں موجود نہ ہو تو پھر قرآن وسنت ہی کی وسعتوں اور گہرائیوں سے اس کا حل قیاس، اجتہاد اور قواعد عامہ کے اصول وضوابط کی روشنی میں مستنبط کیا جاتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں جن مسائل میں وحی نازل نہیں ہوئی ہوتی تھی، ان میں اجتہاد فرما لیا کرتے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بھی اجتہادی تربیت فرمائی اور آپ ﷺ اپنی زندگی ہی میں وقتاً فوقتاً ان کے اجتہادات کی تصحیح یا تائید فرماتے رہتے تھے۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں اجتہاد کا یہ عمل ریاستی وقومی سطح پر منظم ہوا۔ تابعین کے دور میں بھی سلطنت اسلامیہ کے وسیع ہو جانے کی وجہ سے نت نئے مسائل سامنے آئے اور روزمرہ زندگی کے معاملات میں اجتہاد کی ضرورت واہمیت اور بڑھ گئی۔ تبع تابعین اور ائمہ اربعہ کے زمانہ میں مسلمان عربوں کے دوسری اقوام کے ساتھ میل جول اور اختلاط کی وجہ سے باہمی معاملات میں پیچیدگیاں بڑھ گئیں، علماء نے مستقل اصول وضع کیے اور ان کی روشنی میں اجتہادی عمل کو اس کے عروج تک پہنچایا۔ کئی ایک مکاتب فکر وجود میں آگئے اور ہر مکتب فکر کے ائمہ نے اپنے اصول وفروع کو مدون کیا۔ چنانچہ فقہ اسلامی کے نام سے ایک بہت بڑا علمی ذخیرہ وجود میں آگیا، جس میں بلاشبہ زندگی کے لاکھوں مسائل کے بارے میں شرعی رہنمائی جاری کی گئی تھی۔ پس ائمہ اربعہ کے دور کے بعد یعنی چوتھی صدی ہجری میں اجتہاد کا جو عمل رک گیا تھا اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ شاید اس کا دروازہ اب قیامت تک کے لیے بند ہو گیا ہے۔ وہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کے جاری نہ ہونے کی وجہ فطری تھی یعنی اجتہادی عمل کی ضرورت پوری ہو گئی تھی لہٰذا اکثر وبیشتر ائمہ سلف نے سابقہ فقہی ذخیرے کی شروحات اور توضیح وتنقیح میں اپنی زندگیاں کھپائیں۔ وقت کے مسائل وسوالات کا کافی وشافی جواب ائمہ سلف نے اپنے اقوال، کتب اور فتاویٰ کے ذریعہ دیا تھا لہٰذا اسی کی اتباع اور اس میں اضافے کا کام جاری رہا۔

سترہویں صدی ہجری کے صنعتی انقلاب، بیسویں صدی ہجری کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے جہاں سارے عالم کو متاثر کیا، وہاں مذہب کی دنیا میں بھی اَن گنت سوال پیدا کر دیے۔ صنعتی ترقی اور معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے کاروبار کی ہزاروں ایسی نئی شکلیں متعارف ہوئیں کہ جن کی شرعی حیثیت معلوم کرنا وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔ سیاسی انقلاب نے جمہوریت، انتخابات، پارلیمنٹ، آئین اور قانون جیسے نئے تصورات سے دنیا کو آگاہی بخشی۔ معاشرتی تبدیلیوں سے مرد وزن کے اختلاط اور باہمی تعلق کی حدود و دائرہ کار جیسے مسائل پیدا ہوئے۔ میڈیکل سائنس اور ٹیکنالوجی نے ایجادات کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، جس سے کئی ایک ایجادات کے بارے میں شرعی حکم جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے اَواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں عالم اسلام کے اکثر و بیشتر ممالک میں اجتہاد کی تحریکیں برپا ہوئیں۔ تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسائل میں علماء نے رہنمائی کی۔ فتاویٰ کی ہزاروں جلدیں مرتب ہوئیں اور اجتہاد کے عمل کو منظم انداز میں آگے بڑھانے کے لیے کئی ایک ادارے وجود میں آنا شروع ہو گئے۔

بیسویں صدی ہجری کے نصف آخر میں اجتماعی اجتہاد کے لیے کئی ایک قومی اور عالمی سطح کے اداروں کی بنیاد رکھی گئی تاکہ اس دور میں اجتہاد کے مشکل ترین عمل کو اجتماعی صورت میں فروغ دیا جائے۔ ان اداروں میں مصر میں "مجمع البحوث الإسلامية" پاکستان میں "اسلامی نظریاتی کونسل" یورپ میں "یورپی مجلس برائے افتاء وتحقیق" مکہ میں "المجمع الفقهي الإسلامي" سوڈان میں "مجمع الفقه الإسلامی" شمالی امریکہ میں "مجمع فقهاء الشريعة" اردن میں "المجمع الملكي لبحوث الحضارة الإسلامية" ہندوستان میں "اسلامی فقہ اکیڈمی" کویت میں "المنظمة الإسلامية للعلوم الطبية" جدہ میں "مجمع الفقه الإسلامي" اور مراکش کی "مجمع أهل البيت" شامل ہیں۔ ان اداروں کے قیام کے مقاصد، اور ان کی سرپرستی میں ہونے والے اجتماعی عمل کے اسباب یا محرکات کئی ایک تھے۔ مختلف علماء نے اپنے مقالہ جات میں ان اَسباب و محرکات کو بیان کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان میں چند ایک کا خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔

علمی و فکری وحدت

اجتماعی اجتہاد کے محرکات و اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے امت مسلمہ میں فکری و علمی وحدت حاصل ہو گی۔ نئے پیش آمدہ مسائل میں جب مختلف مکاتب فکر، ممالک اور مدارس دینیہ سے تعلق رکھنے والے علماء فتویٰ جاری کرتے ہیں تو ایک ہی فتوے میں متعدد متضاد آراء سامنے آتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی ترقی کی وجہ سے یہ باہم متضاد فتاویٰ اسلامی معاشروں میں بہت تیزی پھیل جاتے ہیں اور سائلین کے لیے پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کے فتاویٰ

میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ پاکستان میں ایک ہی مسلک سے تعلق رکھنے والے بعض علماء اسلامی بینکاری کو جائز جبکہ بعض دوسرے اس کو ناجائز قرار دے رہے ہیں۔ لہٰذا ایک ہی مسلک کے ماننے والوں کے مابین حلال و حرام کے اختلاف پیدا ہو گئے ہیں۔ بعض مسائل میں تو یہ اختلاف ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی، الزامی تقاریر، جوابی تحریر اور طعن و تشنیع تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اجتماعی فتویٰ کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے تاکہ فقہی مسائل و فتاوی کے اختلافات کم سے کم واقع ہوں۔ ڈاکٹر عبد المجید السوسوۃ حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"امت اسلامیہ کو اس وقت ان تمام چیزوں کی شدید ضرورت ہے جن سے اس کی وحدت مضبوط ہوتی ہو اور علماء جن مسائل کا حل پیش کریں، ان میں اتحاد رائے ہو تاکہ امت اپنی پالیسیوں اور باہمی تعامل میں یکسانیت پیدا کر سکے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک امت باہمی منافرت پیدا کرنے والی انفرادی آراء سے دور ہوتے ہوئے اپنے مسائل اور مشکلات کا حل ایسی اجتماعی رائے کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے، جو امت کو جمع کر دے اور ان کی صفوں میں اتحاد پیدا کر دے۔ انفرادی آراء امت کے نظریات میں تفرقہ، صفوں میں افتراق اور احکام میں تشدد پیدا کرتی ہیں۔ ان وجوہات سے عامۃ الناس انفرادی فتاویٰ کے معاملے میں حیران و پریشان ہو جاتے ہیں۔ امت کو عمومی مسائل میں ایک ہی رائے اور حکم کے حصول کی خاطر، اسی طریقہ کار پر عمل کرنا چاہیے۔ شاید اجتماعی اجتہاد ہی وہ رستہ ہے، جس کے ذریعے اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔"[1]

یہ بات بھی واضح رہے کہ امت کی علمی و فکری اتحاد کی اہمیت مسلم ہے لیکن اتباع حق کے جذبے پر اس محرک کو غالب نہیں ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر کیمرے کی تصویر کے جواز و عدم جواز کے بارے میں کوئی مشورہ کرنے کے لیے علماء کی ایک جماعت باہمی مذاکرہ کرتی ہے۔ اور اگر اس مجلس کے بعض اراکین دلائل اور فکر و نظر کے اختلاف کے باوجود اجتماعی رائے کے حصول کی خاطر اپنی ان انفرادی آراء سے رجوع کر لیتے ہیں، جن کو وہ حق سمجھتے ہیں یا اتحاد امت کے جذبے کی خاطر بغیر غور و فکر اور تحقیق کے مجلس کے اجتماعی فتویٰ کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں تو یہ ایک نامناسب طرز عمل ہے۔ اسلام میں اجتماعیت مطلوب ہے لیکن ایسی بھی نہیں کہ تکلف سے پیدا کی جائے بلکہ باہمی آزادانہ مشاورت اور بحث و تمحیص کے نتیجے میں اگر علماء کی ایک جماعت کا کسی مسئلے کے شرعی حل پر اتفاق ہوتا نظر آتا ہے تو یہ مستحسن امر ہے۔ پس اجتماعیت کے حصول کے جذبے کو اتباعِ حق پر غالب نہیں آنا چاہیے۔

---

[1] السؤسوة، عبد المجيد، الدكتور، الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي: ص88-89، وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، قطر، الطبعة الأولى، 1998م

مذہبی و گروہی تعصب میں کمی

بعض علماء کا کہنا ہے کہ انفرادی اجتہاد نے مذہبی و گروہی تعصب بڑھا دیا ہے۔ ہر مذہب و مسلک کے علماء اپنی انفرادی حیثیت میں فتاویٰ جاری کرتے ہیں جو عموماً اپنے موقف کے اثبات سے زیادہ دوسرے کی رائے پر تنقید پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہی فتاویٰ جات مختلف مسالک کے علماء یا علمی حلقوں کے مابین مناظرے کی صورت بھی اختیار کر جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے رد میں کتابیں اور علمی مقالے تحریر کیے جاتے ہیں اور مخالف مکتب فکر کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اپنے مسلک کے بڑوں کی تعریف میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں اور مخالف مذہب کے علماء پر کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں عامۃ الناس میں بھی ایک دوسرے کے مسلک و مذہب کے خلاف نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ ڈاکٹر شعبان محمد اسماعیل حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"اجتماعی اجتہاد کی دعوت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ انفرادی فتاویٰ میں اختلافات کے نتیجے میں باہمی مخالفتیں بڑھ جاتی ہے اور امت تنگی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر خاص و عام کے علم میں ہے۔ اس مسئلے کا بہترین شاہد وہ اختلاف ہے جو علماء کے مابین حصص سرٹیفکیٹس کی حلت و حرمت کے بارے میں پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ یہ اختلاف باہمی طعن و تشنیع اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے کی حد تک پہنچ گیا۔ اس قسم کے شدید اختلاف کا عام مسلمانوں پر بہت ہی برا اثر پڑا۔ اگر اس مسئلے کو کسی فقہی مجلس یا اکیڈمی کے ذریعے حل کر لیا جاتا' جیسا کہ بالآخر ایسا ہی کیا گیا تو ہم اس سب کچھ سے بچ سکتے تھے۔ جماعت کی رائے انفرادی رائے کے مقابلے میں نسبتاً صحیح ہوتی ہے اور یہ بھی ہے کہ اجتماعی رائے انفرادی رائے کے بالمقابل زیادہ قابل قبول ہوتی ہے۔"[1]

بعض علماء کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں تفرقے کی بنیاد ہی انفرادی اجتہاد ہے لہٰذا اس پر پابندی لگا دینی چاہیے اور صرف اجتماعی اجتہاد کے منہج کو برقرار رکھا جائے۔ شیخ عبد الوہاب خلاف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جن مسائل میں قرآن و سنت میں کوئی صریح حکم نہیں ہے تو ان میں اجتماعی اجتہاد ہو گا۔ وہ لکھتے ہیں:

"جن لوگوں کے پاس اجتہاد بالرائے کا اختیار ہے، ان سے مراد وہ قانون ساز جماعت ہے جس کے ہر ایک رکن میں وہ اجتہادی صلاحیت پائی جاتی ہو جس کی طرف علماء نے رہنمائی کی ہے۔ کسی بھی فرد کو اجتہاد بالرائے کا اختیار نہیں ہے، چاہے وہ کس قدر اہلیت و صلاحیت اور کمالات کیوں نہ رکھتا ہو، کیونکہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ

[1] الشعبان، محمد إسماعيل، الدكتور، الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تطبيقه: ص 121، جامعة القاهرة، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولى، 1418هـ

فقہ اسلامی میں قانونی انتشار کے بڑے اسباب میں سے ایک اہم سبب انفرادی اجتہاد بھی ہے۔"[1]

ہمارے خیال میں شیخ کی یہ رائے درست نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اجتماعی اجتہاد کی اہمیت مسلم ہے لیکن اس کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں ہے کہ اجتماعی اجتہاد کی مدح سرائی میں انفرادی اجتہاد، جو کہ اس کی اصل ہے، اسی کا رد کرنا شروع کر دیا جائے اور بغیر کسی دلیل کے فرقہ وارانہ تعصب کی بنیاد ائمہ سلف کے انفرادی اجتہاد کو قرار دیا جائے۔ ڈاکٹر شعبان محمد اسماعیل حفظہ اللہ، شیخ عبد الوہاب خلاف رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"انفرادی اجتہاد کو لاقانونیت قرار دینے میں ایک اعتبار سے مبالغہ ہے۔ دوسرے پہلو سے اس بیان میں مختلف زمانوں کے نامور علمائے مجتہدین مثلاً امام ابو حنیفہ (متوفیٰ 150ھ)، امام مالک (متوفیٰ 179ھ)، امام شافعی (متوفیٰ 204ھ)، امام احمد بن حنبل (متوفیٰ 241ھ)، امام لیث بن سعد (متوفیٰ 175ھ)، امام ابو ثور (متوفیٰ 246ھ)، امام ابن تیمیہ (متوفیٰ 728ھ)، امام ابن قیم (متوفیٰ 751ھ) اور امام شوکانی (متوفیٰ 1250ھ) رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کی اجتہادی کاوشوں کا انکار بھی شامل ہے، جنہوں نے امت مسلمہ میں وہ فکری بیداری پیدا کی کہ جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ اجتماعی اجتہاد کی اہمیت بیان کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی بھی حال میں انفرادی اجتہاد کا ہی انکار کر دیا جائے۔"[2]

فقہ الواقع کا صحیح علم نہ ہونا

تہذیب و تمدن کی ترقی سے پیدا شدہ نئے علوم و فنون میں اس قدر وسعت ہو گئی ہے کہ کسی ایک شخص کے لیے جدید علوم کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ خصوصاً علم معاشیات اور میڈیکل سائنس نے بہت سے افعال واعمال کے بارے میں جواز اور عدم جواز کے سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ ایک عالم دین جس نصاب تعلیم سے گزرتا ہے، اس میں معاشیات، طب یا دوسرے معاصر علوم و فنون کی تعلیم و تربیت شامل نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان مسائل میں انفرادی فتویٰ جاری کرنے کے لیے بہت زیادہ محنت و تحقیق کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر کلوننگ جائز ہے یا ناجائز؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ جس کا جواب اسی صورت دیا جا سکتا ہے جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ کلوننگ فی الواقع کیا شیء ہے؟ پس کلوننگ سے متعلقہ جمیع معلومات کو فقہ الواقع کا علم کہتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈ کا استعمال جائز ہے یا ناجائز؟ ایک تو اس مسئلے کا شرعی پہلو ہے جبکہ دوسرا واقعاتی ہے پس کریڈٹ کارڈ کیا چیز ہے؟ یہ فقہ الواقع کا مسئلہ ہے۔ فقہ الواقع کو جاننے کے بعد پر اس پر فقہ الأحکام کا اطلاق کیا جاتا ہے اور فقہ الواقع پر فقہ

[1] خلاف، عبد الوهاب، شيخ، مصادر التشريع فيما لا نص فيه: ص13، دار القلم، كويت

[2] الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تطبيقه: ص 122

الأحکام کی اس تطبیق کا نام اجتہاد ہے۔

اجتہاد کی ایک صورت حکم شرعی کی تلاش ہے جبکہ دوسری صورت اس حکم کا اطلاق۔ اجتہادی کی دوسری قسم کو فقہاء کی اصطلاح میں تحقیق المناط بھی کہتے ہیں۔ پس حکم شرعی کے اطلاق میں فقہ الواقع کا علم ہونا از بس ضروری ہے۔ عصر حاضر میں تحقیق المناط میں صحیح رائے تک پہنچنے کے لیے اجتماعی اجتہاد ایک بنیادی ضرورت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ علماء کی ایک جماعت کسی بھی جدید مسئلے میں متعلقہ علوم کے ماہرین فن کے ساتھ بیٹھ کر پہلے اس مسئلے کو سمجھے گی اور پھر اس پر حکم شرعی کا اطلاق کرے گی۔ یہ واضح رہے کہ فقہ الواقع کو سمجھنے میں تو ماہرین فن سے مشورہ کیا جائے گا لیکن حکم کا اطلاق صرف علماء کی جماعت ہی کرے گی۔ ڈاکٹر عبد المجید السوسوۃ لکھتے ہیں:

"اکثر و بیشتر جدید مسائل کو اس قدر مختلف حالات اور تنوعات نے گھیرا ہوتا ہے اور ان مسائل کا دوسرے علوم و واقعات کے ساتھ ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اجتماعی اجتہاد کے بغیر ان قضایا کے جمیع پہلوؤں اور متعلقات کے احاطے پر قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ اکیلے شخص کے لیے یہ مشکل ہے کہ وہ ان مسائل سے متعلقہ جمیع علوم و فنون کا احاطہ کر سکے۔ لہٰذا ان مسائل میں انفرادی اجتہادی آراء عموماً کوتاہی پر مبنی ہوتی ہیں۔ پس بعض اوقات ایک عالم دین ان پیچیدہ اور الجھے مسائل میں ایک پہلو کو مد نظر رکھتا ہے تو دوسرا پہلو اوجھل ہو جاتا ہے کہ جس کی وجہ سے ناقص رائے سامنے آتی ہے۔"[1]

بعض اوقات فقہ الواقع کا صحیح فہم نہ ہونے کے سبب سے علماء کے لیے انفرادی اجتہاد میں خطا کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور کسی حتمی رائے تک پہنچنے میں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ مولانا زاہد الراشدی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"دوسری طرف علمائے کرام کا یہ طرز عمل بھی محل نظر ہے کہ محل سے ناواقفیت یعنی متعلقہ مسئلہ کے "ماله وما علیه" اور اس کے حوالے سے مروجہ عرف و روایات سے عدم آگاہی کے خلا کو متعلقہ شعبہ کے کچھ افراد سے پوچھ گچھ کی صورت میں پُر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے اور حالات زمانہ اور مروجہ عرف و روایات سے اس درجہ کی "عملی ممارست" کو ضروری نہیں سمجھا جا رہا جو کسی زمانے میں ہمارے فقہاء کا طرہ امتیاز ہوتی تھی۔ مثال کے طور عبادات اور لاؤڈ سپیکر کے جواز و عدم جواز کی بحث پر ایک نظر ڈال لیجیے جس میں طویل بحث و مباحثہ کے بعد کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنے میں ہمیں کم و بیش ربع صدی کا وقت لگا اور اگر اس کے اسباب کا تجزیہ کریں تو سب سے بڑا سبب وہی لاؤڈ سپیکر کے تکنیکی معاملات "عملی ممارست" کا فقدان قرار پائے گا جس نے ہمیں ربع صدی تک

[1] الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي: ص78

تکنیکی بحث میں الجھائے رکھا۔"[1]

وسائل حمل و نقل کا ارتقاء

ائمہ سلف کے دور میں وسائل حمل و نقل بہت کم تھے۔ ایک سے دوسرے شہر سفر کرنے کے لیے سینکڑوں میل کا فاصلہ اونٹوں، گھوڑوں اور خچروں پر مہینوں میں طے کیا جاتا تھا۔ اس لیے ایک شہر کے علماء کے لیے ایک جگہ جمع ہونا تو کسی قدر ممکن تھا لیکن مختلف اسلامی شہروں کے علماء و مجتہدین کا جمع ہو کر کوئی فقہی مجلس قائم کرنا اور اس مجلس کے ماہانہ یا سالانہ بنیادوں پر اجلاس منعقد کرنا ایک بہت مشکل اَمر تھا۔ عصر حاضر میں ذرائع حمل و نقل میں انقلابی تبدیلیوں کی وجہ سے دنیا کے تمام یا اکثر ممالک کے علماء کو ماہانہ یا سالانہ بنیادوں پر جمع کرنا بہت ہی آسان اور سہل ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک جگہ جمع ہوئے بغیر بھی کسی فقہی مجلس کے انعقاد کے امکانات آئے روز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ انٹرنیٹ، ٹیلی فون، موبائل، کمپیوٹر اور کیبل وغیرہ نے باہمی رابطے کو بہت ہی آسان کر دیا ہے۔ ہوائی جہاز نے ایک ملک سے دوسرے ملک بلکہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک کے سفر کو بھی آسان کر دیا ہے۔ ماضی میں جہاں انسان مہینوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پہنچتا تھا، آج وہاں گھنٹوں میں پہنچا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد الدسوقی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"ہمارا معاصر ماحول ہم سے دو وجوہات کی بنا پر اجتماعی اجتہاد کے اہتمام کا مطالبہ کرتا ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ گھر اور علاقے جس قدر دور ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی فقہاء کے لیے ایک جگہ مل بیٹھنا آسان ہو گیا ہے۔ اور یہ آسانی معاصر ذرائع مواصلات سے پیدا ہوئی ہے۔ جیسا کہ ساری دنیا نے مل کر ایک بین الاقوامی تنظیم بنائی ہوئی ہے جو مختلف ممالک کی مشکلات پر غور و فکر کرتی ہے اور ان کے بارے میں قراردادیں پاس کرتی ہے۔ اسی طرح عالم اسلام کے لیے بھی یہ ممکن ہے کہ ان کی ایک فقہی کانفرنس ہو جس میں ائمہ فقہاء کی باہم ملاقات ہو۔ فقہاء کی یہ کانفرنس سیاسی خواہشات اور باہم دگر متضاد فکری رجحانات سے دور رہتے ہوئے ایک طے شدہ علمی لائحہ عمل کے مطابق ان مسائل پر بحث کرے جو آج امت کو درپیش ہیں۔"[2]

اب تو ویڈیو کانفرنس کا تصور بھی بہت عام ہو گیا ہے۔ جس میں کچھ لوگ ایک جگہ موجود ہیں جبکہ کچھ دوسرے اصحاب ٹیلی ویژن اسکرین کے ذریعے اس مجلس کی گفتگو میں شریک ہوتے ہیں، مجلس کی کاروائی کا گھر بیٹھے مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور پھر ٹیلی فونک رابطے کے ذریعے اپنی آراء و تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔

---

[1] راشدی، زاہد ابو عمار، مولانا، عصر حاضر میں اجتہاد، چند فکری و عملی مباحث: ص 148، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ، طبع اول 2008ء

[2] الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تطبيقه: ص 134

انفرادی اجتہاد کے منفی نتائج کا سدباب

بعض علماء کا خیال ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں اجتہاد کے عمل سے اس لیے منع کیا گیا کہ نااہل لوگ مجتہد بن بیٹھیں گے، فتویٰ دینے میں جلدی اور جرات کا مظاہرہ کریں گے لہٰذا خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ چوتھی صدی ہجری اور مابعد کے ائمہ سلف نے اجتہاد کا انکار اس معنیٰ میں نہیں کیا کہ وہ قیامت تک کے لیے اجتہاد کے دروازے کو بند کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے پیش نظر یہ اندیشہ تھا کہ بغیر اہلیت وصلاحیت کے لوگ مجتہد ہونے کا دعویٰ کریں گے اور فکری وعلمی انتشار میں اضافے کا سبب بنیں گے، جبکہ عصر حاضر میں انفرادی اجتہاد کے عمل کو اجتماعیت کے ذریعے منضبط کیا جاسکتا ہے اور ائمہ سلف کی نسبت معاصر علماء میں علم وضبط کی جو کمی یا نقص پایا جاتا ہے، اسے ایک جماعت کا علم یا ضبط پورا کر سکتا ہے۔ آج انفرادی طور پر کسی شخص کا مجتہد مطلق ہونا تو مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن عالم اسلام کے نامور علماء کی ایک فقہی مجلس مجتہد مطلق کی جگہ کفایت کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر عبد المجید حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"شروع شروع میں اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کا جو فتویٰ جاری کیا گیا تو اس سے مقصود انفرادی اجتہاد پر پابندی لگانی تھی تاکہ نااہل لوگوں کو اجتہاد سے دور رکھا جاسکے۔ اس کے برعکس یہ کج فہمی عام ہوگئی اور رواج پاگئی کہ سلف کا مقصود مطلق طور پر اجتہاد کی ممانعت تھی۔ جبکہ اصل ذمہ داری یہ تھی کہ اجتہاد کے عمل میں لاقانونیت کو منظم کیا جاتا اور یہ عمل ایک فرد کی بجائے جماعت کے ہاتھ میں پکڑایا جاتا، بجائے اس کے اس کا علاج یہ کیا جائے کہ اجتہاد کا دروازہ ہی بند کر دیا جائے۔"[1]

ڈاکٹر محمد سلام مدکور حفظہ اللہ عصر حاضر کے مجتہدین اور ان کے اجتہادات کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اب تو یہ ہو رہا ہے کہ ہر وہ شخص جس میں کچھ فقہی بصیرت پائی جاتی ہو، اجتہاد کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور لوگوں کے سامنے اپنی اجتہادی آراء پیش کرنا شروع کر دیتا ہے، اگرچہ اس میں اجتہاد کی اہلیت نہ بھی ہو اور اس میں اجتہاد کی اکثر وبیشتر شروط بھی نہ پائی جاتی ہوں۔ پس متضاد آراء اور پریشان خیالیاں سامنے آتی ہیں اور عوام الناس جس کو بھی پڑھتے یا سنتے ہیں، حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔"[2]

استاذ مصطفی الزرقاء رحمہ اللہ (متوفیٰ 1999ء) نے بھی معاصر انفرادی اجتہاد کے عمل کے بارے میں اسی قسم کے خدشات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر عبد المجید حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"اسی طرح دین کو تجارت بنانے والے ان لوگوں سے بھی یہ اندیشہ ہے جو اس منہج پر اپنی کتابیں اور فتاوی شائع

---

[1] الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي: ص85

[2] أيضاً: ص85-86

کرتے ہیں اور ان کے ذریعے طاغوتوں کا قرب حاصل کرتے ہیں یا دشمنان اسلام کی خدمت کرتے ہیں۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جو اجتہاد اور آزادی فکر کی چادر تلے دین کی بنیادوں کو ڈھانا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنے پسندیدہ مفادات حاصل کر سکیں اور اس عمل میں اللہ کے غیظ وغضب کی بھی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کرتے۔"[1]

اجتہاد کا عمل فی نفسہ ایک مستحسن امر ہے اور ہر دور میں معاشرے کی ایک ضرورت ہے۔ اگر اس میں خارجی ماحول کی وجہ سے کچھ خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں تو ان خرابیوں اور نقائص کا سد باب کرنا چاہیے نہ کہ مستقل طور پر اس عمل ہی کو ختم کر دیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جن اندیشوں کا مذکورہ بالا عبارتوں میں تعین کیا گیا ہے، ان کا ازالہ اجتماعی اجتہاد کے ذریعے ممکن ہے۔ ڈاکٹر عبد المجید حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"اس لیے وقت کی یہ ضرورت ہے کہ اجتہاد، اجتماعی سطح پر ہونا چاہیے تاکہ اجتہاد کے نام نہاد دعویداروں کے لیے اجتہاد کے دروازے بند ہو جائیں۔ علاوہ ازیں امت کے لیے اللہ تعالی کی شریعت کا کمال درجے میں گہرا فہم بھی ممکن ہو سکے گا۔ اجتماعی اجتہاد کے اس طریق کار میں انفرادی آراء پر کوئی رکاوٹ یا قرآن وسنت پر انفرادی غور پر پابندی عائد کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے اصل مقصود امت کو دینی معاملات میں انتشار ذہنی اور پریشانی سے بچانا ہے۔"[2]

جدید مسائل کا پیچیدہ ہونا

علوم و معارف کی ترقی اور ایجادات کے انقلاب نے مسائل کو بہت زیادہ گھمبیر اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کی معاشرت، رہن سہن کاروبار زندگی اور روزمرہ کے معاملات انتہائی سادہ تھے لہٰذا ایک فقیہ اور مجتہد کے لیے واقعاتی صورت حال کو سمجھنا اور اس کے بارے میں کوئی شرعی رہنمائی فراہم کرنا آسان تھا۔ عصر حاضر میں زندگی کے مختلف شعبے اور علوم اس طرح آپس میں مل گئے ہیں کہ ان کی تنقیح اور چھان پھٹک کرتے ہوئے اصل واقعاتی صورت کو نکھارنا اکیلے فرد کے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ فقہ الواقع کو نکھارنے کے لیے ماہرین فن کی ایک جماعت چاہیے جو مختلف علوم کی روشنی میں متعدد پہلوؤں سے واقعے کی صورت حال کو واضح کرنے کی کوشش کریں۔ ڈاکٹر شعبان محمد اسماعیل حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"انسانی زندگی کی نشوونما اور ترقی سے کئی ایک پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں مثلاً بینکوں کے ساتھ معاملات کی حدود، تجارتی، زرعی اور سرمایہ کارانہ مقاصد کے تحت قرضے جاری کرنا، انشورنس کے مختلف مسائل، جوائنٹ

[1] الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي: ص86

[2] أيضاً: ص86

اسٹاک کمپنیاں کہ جن کے اصل زر کا علم نہ ہو، جدید معاشی عقود مثلاً برآمدات اور اسٹاک ایکسچینج نے جو قیمت نکالی ہے اس پر حصص کی خرید و فروخت، بحری اور ہوائی جہازوں کو آڈر پر تیار کروانے کے معاہدے وغیرہ، کرنسی کے تبادلے اور خرید و فروخت کے صیغوں کی رعایت، ہنڈی اور ڈرافٹ بل کی ادائیگی، میعادی بیوع، زمین کی پیداوار کے عوض اس کا کرایہ، قرض کی واپسی اس کے حصول والے دن کی قیمت پر ہوگی یا اس مسئلے میں کوئی رستہ نکالا جائے گا، جدید آلات اتصال مثلاً فیکس، ٹیلی فیکس اور ای میل وغیرہ کے ذریعے عقود کا اجراء، ایک جسم سے دوسرے جسم میں اعضاء کی منتقلی، اور خاص طور پر نئے اعضاء تخلیق کر کے ان کی پیوند کاری کہ جس میں ڈاکٹروں کی ایک خاص رائے ہے اور اس کے علاوہ کئی ایک جدید مسائل ایسے ہیں کہ جن میں انفرادی اجتہاد کفایت نہیں کرے گا بلکہ اس میں باہمی مشاورت اور علماء کی ایک جماعت کی آراء سے کوئی رائے نکالی جائے گی۔"[1]

مجتہد مطلق کے حصول میں ابعاد

یہ فکر بھی علماء کے حلقے میں عام پائی جاتی کہ علوم و معارف کی وسعت اور فقہ الواقع کے تنوع کی وجہ سے عصر حاضر میں مجتہد مطلق کا وجود بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اجتماعی اجتہادات کے ذریعے فقہی مجالس اس خلاء کو پر کر سکتی ہیں۔ اگرچہ انفرادی طور پر علماء میں مجتہد مطلق کی شرائط کا کامل درجے میں پایا جانا ممکن نہیں لیکن مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھنے والے علماء و متخصصین کی ایک جماعت اجتماعی طور پر ان شرائط پر پورا اتر سکتی ہے جو سلف صالحین نے اجتہاد مطلق کے ذیل میں بیان کی ہیں۔ ڈاکٹر عبد المجید حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"اجتماعی اجتہاد سے اجتہاد کی دو سطحوں پر کمال پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو مجتہدین کی سطح پر اور دوسرا محل اجتہاد یعنی واقعاتی سطح پر۔ جہاں تک مجتہد کی سطح پر کمالیت کے حصول کا معاملہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ درجہ اجتہاد تک پہنچنے کے لیے جو شروط مقرر کی گئی ہیں، ہمارے اس زمانے میں ان تک پہنچنا بہت ہی مشکل ہے۔ اسی لیے اجتماعی اجتہاد میں علماء میں سے بعض، بعض کی تکمیل کرتے ہیں اور اس طرح مجموعی طور پر یہ سب علماء مجتہد مطلق کے درجے تک پہنچ جاتے ہیں۔"[2]

اجتماعی اسلامی فقہ کا حصول

اجتماعی اجتہاد کا ایک اہم محرک یہ بھی ہے کہ اس عمل کے ذریعے مدون ہونے والی فقہ 'اسلامی فقہ' کہلائے گی۔ اس اجتماعی فقہ کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر بہت گہرے اور مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ باہمی

[1] الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تطبيقه: ص119-120

[2] الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي: ص90

منافرت کی جگہ محبت و الفت کی فضاء پروان چڑھے گی۔ مختلف مکاتب فکر کے علماء اور ان کے متبعین کے لیے ہمدردی واخوت کا جذبہ نمایاں رہے گا۔ عامۃ الناس کا علماء کے طبقے پر اعتماد بڑھے گا اور اسلام کے بارے میں سیکولر عناصر کا یہ اعتراض رفع ہو جائے گا کہ کون سا اسلام درست ہے؟ حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی؟ ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 2010ء) لکھتے ہیں:

"دور جدید میں اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں غور وخوض ہو رہا ہے۔ اسلام کی دستوری فکر پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ مختلف مسلم ممالک میں دستوری تصورات پر مباحثے ہو رہے ہیں... یہ کام پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔ مصر اور دوسرے عرب ممالک میں بھی ہو رہا ہے۔ ان میں سے کسی کام کو حنفی یا شافعی یا حنبلی یا مالکی مسلک کی حدود میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت دنیائے اسلام میں "اسلامی دستور سازی" کا کام ہو رہا ہے۔ "حنفی دستور سازی" یا "مالکی" اور "حنبلی دستور سازی" کا کام نہیں ہو رہا ہے۔ پاکستان میں اگر اسلامی دستور کی طرف پیش رفت ہوئی ہے تو وہ اسلامی دستور کی طرف پیش رفت ہوئی ہے، کسی حنفی یا مالکی دستور کی طرف پیش رفت نہیں ہوئی ہے... اس لیے فقہ اسلامی کا یہ نیا ارتقاء اور یہ نیا رجحان مسلکی نہیں، بلکہ مسلکی حدود سے ماوراء ہے۔ اس لیے آئندہ آنے والے سال، عشرے یا صدی مسلکوں کی صدی نہیں ہو گی بلکہ یہ فقہ اسلامی کی مشترک صدی ہو گی۔"[1]

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فقہ کو "کوسموپولیٹن" فقہ کا نام دیا ہے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیائے اسلام میں باہمی مشاورت اور اشتراک عمل سے اجتہادی کام کیا جا رہا ہے۔ اس اجتماعی اجتہاد کے نتیجہ میں فقہی مسالک کی حدود مٹ رہی ہیں۔ ایک نئی فقہ وجود میں آ رہی ہے جس کو نہ فقہ حنفی کہہ سکتے ہیں نہ مالکی، نہ حنبلی، نہ جعفری۔ بلکہ اس کو اسلامی فقہ ہی کہا جائے گا۔ میں اس کے لیے (Cosmopolitan Fiqh) یعنی عالمی یا بین دیسی فقہ کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں۔"[2]

ایک تو جدید مسائل میں اجتماعی اجتہاد کے ذریعے اسلامی فقہ کے حصول کی طرف پیش رفت ہو رہی ہے، دوسری طرف مذاہب اربعہ اور اہل الحدیث کے کبار علماء پر مشتمل ایک ایسی فقہی مجلس تشکیل دی جا سکتی ہے جو سابقہ فقہی اقوال میں اجتہاد کرتے ہوئے ان میں راجح و مرجوح کا تعین کرے اور جمیع فقہی مذاہب سے استفادہ کرتے ہوئے فقہ اسلامی کا ایک جامع انسائیکلوپیڈیا تیار کیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کی ایک جماعت اجتماعی اجتہاد کے لیے جمع ہو گی تو وہ کسی ایک مذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے یا ایک ہی فقہ کے اصول و فروع پر اپنے اجتہاد کی بنیاد نہیں رکھے گی بلکہ اجتہاد کی اس قسم میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی،

---

[1] غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، محاضرات فقہ: ص 477-478، الفیصل غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، 2005ء

[2] ایضاً: ص 534

ظاہری اور اہل الحدیث کے مصادر علمیہ سے یکساں طور پر استفادہ کیا جائے گا یعنی سلف صالحین کے جمیع فقہی ذخیرے کو ایک ہی فقہ شمار کرتے ہوئے اس سے استفادہ ممکن ہو گا۔ ڈاکٹر طاہر منصوری حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"اجتماعی اجتہاد کی تحریک کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں تمام فقہی مسالک اور فقہاء کرام کے فقہی ذخیرہ کو بڑی حد تک مشترکہ علمی ورثہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں تمام فقہاء کرام کے اجتہادات و فرمودات سے یکساں استفادہ کیا جاتا ہے۔ نئے مسائل کے حل میں کسی خاص فقہی مسلک پر انحصار کرنے کی بجائے تمام مسالک کے فقہی ذخائر سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے اور وہ نقطہ نظر اختیار کیا جاتا ہے جو قرآن و سنت کی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہو اور بندگان خدا کے مصالح اور عصر حاضر کے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔ اس طرح اجتماعی اجتہاد کے نتیجہ میں ایک نئی اجتماعی فقہ وجود میں آرہی ہے جو پوری امت مسلمہ کا مشترک علمی، فکری اور قانونی سرمایہ ہے۔"[1]

سلف صالحین کے طریقے کی اتباع

اجتماعی اجتہاد کا منہج و طریقہ کار کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ دور نبوت، خلفائے راشدین، تابعین عظام اور ائمہ اربعہ کے دور میں اس کا بہت رواج تھا۔ خلفائے راشدین کا دور اجتماعی اجتہاد کے عروج کا زمانہ ہے۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا طرز عمل یہ تھا کہ جب ان کو کوئی نیا مسئلہ درپیش ہوتا تو مدینہ میں موجود صحابہ رضی اللہ عنہم کو بلواتے اور ان سے اس بارے مشورہ لیتے تھے اور باہمی مشاورت کے بعد کوئی رائے جاری کر دیتے تھے۔ تابعین کے زمانے میں مدینہ میں فقہائے سبعہ کی علمی مجلس قائم تھی۔ تاریخ کی کتب میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی مجالس کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ ائمہ اربعہ کے دور کے بعد بھی تاریخ اسلامی کے مختلف ادوار میں گاہے بگاہے اجتماعی اجتہاد کی کاوشیں جاری رہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں "فتاویٰ عالمگیریہ" اور سلطنت عثمانیہ میں "مجلة الأحكام العدلية" کی ترتیب و تدوین اجتماعی اجتہادی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے۔ لہٰذا عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد کے طریقہ کار کو فروغ دینا درحقیقت خیر القرون کی سنت کو زندہ کرنے کے مترادف ہے۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ اجتماعی اجتہاد و قیاس اس امت میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ غور کیا جائے تو پورے تسلسل کے ساتھ اس کی نظیریں ہمیں پچھلے چودہ سو سال کے اندر ملتی ہیں اور خود عہد رسالت کے اندر ملتی ہیں۔ اساری بدر (بدر کے قیدیوں) کے واقعہ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ حضرات علمائے کرام کو معلوم ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا، اس میں خطا ہوئی اور اس پر عتاب بھی ہوا،

[1] منصوری، محمد طاہر، ڈاکٹر، اجتماعی اجتہاد، تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں: ص 23، ادارۃ تحقیقات اسلامیہ، اسلام آباد، 2007ء

یہ اجتماعی اجتہاد تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی ایسی ایک مجلس بنائی تھی، ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں کہ جو بھی نئے مسائل امت کو پیش آتے، خلفائے راشدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ان سے دریافت کرتے کہ آپ نے کوئی حدیث اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو تو بتائیں، اگر حدیث مل جاتی تو فیصلہ ہو جاتا ورنہ اجتہاد و قیاس سے فیصلہ کیا جاتا تھا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگردوں کے ساتھ بحث و مذاکرہ کا سلسلہ قائم فرمایا اور تقریباً چالیس عظیم المرتبت تلامذہ کے ساتھ اجتماعی اجتہاد و قیاس کا سلسلہ جاری رکھا۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے "فتاویٰ عالمگیریہ" مرتب کرنے کے لیے علماء کو جمع کیا، اس زمانے میں حالات بدلے ہوئے تھے، نئے مسائل پیدا ہوتے تھے، انہیں حل کرنے کی ضرورت تھی اسی لیے "فتاویٰ عالمگیریہ" مرتب ہوا۔ اس زمانہ کے فقہاء کی جلیل القدر جماعت مقرر کی گئی۔ "مجلة الأحكام العدلية" خلافت عثمانیہ میں مرتب ہوا، یہ بھی علماء ہی کی ایک عظیم جماعت نے مرتب کیا۔"[1]

قانون سازی میں معاونت

اسلامی تاریخ کے تیرہ سو سالوں میں کسی خطہ ارضی میں کوئی متعین اسلامی قانون نافذ نہیں رہا بلکہ عدالتوں میں موجود مجتہد قاضی کسی ایک خاص مسلک کی فروعات یا اپنے ذاتی اجتہادات کی روشنی میں مقدمات کے فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ اسلامی ممالک میں قانون سازی کا رواج مغرب سے در آمد شدہ ہے۔ غیر مسلم ممالک، ریاستوں اور اداروں کے ساتھ تجارتی، معاشی اور معاشرتی تعلقات بڑھنے کی وجہ سے مسلم ریاستوں میں بھی قانون سازی کی ضرورت محسوس کی گئی۔ بہت سے اسلامی ممالک میں علماء نے قانون سازی کے اس عمل کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آگے بڑھانے پر زور دیا کہ جس کے سبب سے عصر حاضر میں فقہی اقوال کی قانون سازی کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ اکثر و بیشتر اسلامی ممالک میں سلف صالحین کے فقہی ذخیرے سے استفادہ کرتے ہوئے اسلامی قانون سازی کی طرف پیش رفت ہو رہی ہے۔ بہتر صورت تو یہی ہے کہ کتاب و سنت کی نصوص کو نافذ کر دیا جائے کہ جو جامعیت ان میں ہے وہ ان کے میں نہیں ہو سکتی لیکن اگر بامر مجبوری قانون سازی مطلوب ہو تو قانون سازی کا یہ عمل اسی صورت بہتر اور مطلوب مقاصد حاصل کر سکتا ہے، جبکہ اس کی بنیاد اجتماعی اجتہاد ہو۔ اگر کسی ایک شخص کی اجتہادی آراء کو بطور قانون نافذ کر دیا جائے گا تو اس میں بہت سی کوتاہیاں ہو گی۔ علاوہ ازیں اجتماعی اجتہاد کی بنیاد پر قانون سازی کرنے کی صورت میں عوام الناس کا اطمینان نسبتاً زیادہ حاصل ہو گا۔ شیخ احمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"انفرادی اجتہاد قوانین کے وضع کرنے میں غیر مفید ہے بلکہ شاید ناممکن ہے کہ ایک یا کچھ افراد مل کر یہ کام کر

[1] جدید فقہی مباحث: 2/31

سکیں۔ اس کا صحیح و مفید طریقہ کار یہی ہے کہ اجتماعی اجتہاد کے ذریعے یہ کام ہو۔ جب افکار کا باہم تبادلہ خیال ہو جائے اور آراء عام ہو جائیں تو صحیح رائے سامنے آ ہی جاتی ہے۔ اگر اللہ چاہے۔"[1]

شیخ احمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ ایک اور جگہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کا طریقہ بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میری رائے میں اس کا عملی طریقہ کار یہ ہے کہ ماہرین قانون اور علمائے شریعت کے ماہرین کی ایک جماعت منتخب کی جائے جو کسی خاص مذہب کی تقلید یا کسی خاص رائے کی پابندی کے بغیر، نصوص قرآن و سنت کی روشنی میں، نئی قانون سازی کے قواعد و ضوابط ایجاد کرے۔ یہ کمیٹی سابقہ ائمہ کے اصول اور فقہی آراء کو سامنے رکھے۔ تمام ماہرین قانون اس کمیٹی کی سرپرستی میں ہوں اور پھر یہ کمیٹی لوگوں کے احوال و ظروف کے مناسب اور کتاب و سنت کے قواعد کے تحت فروعی مسائل مستنبط کرے۔ لیکن اس کے اجتہادات نہ تو کسی نص سے متصادم ہوں اور نہ ہی دین کی کسی ضروری شئے کے انکار پر مبنی ہوں۔"[2]

عوامی مسائل میں اجتماعی اجتہاد

نفس مسئلہ کے اعتبار سے مسائل کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم تو ان مسائل کی ہے جو کسی شخص کی انفرادی زندگی سے متعلق ہیں جیسا نماز، روزہ اور ذاتی معاملات وغیرہ۔ مسائل کی دوسری قسم وہ ہے جن کی نوعیت عمومی ہوتی ہے یعنی وہ پوری قوم یا قوم کی اکثریت کے مسائل ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسے مسائل میں اجتماعی اجتہاد کے ذریعے کوئی فیصلہ جاری کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر خلیفہ وقت کی تقرری پوری امت کا اتفاقی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے میں پوری امت یا امت کے منتخب نمائندوں کی اجتماعی رائے کی روشنی میں خلیفہ وقت کا انتخاب ہونا چاہیے۔ استاذ علی حسب اللہ حفظہ اللہ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ احکام شرعیہ کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم کے احکامات وہ ہیں، جن کا تعلق عبادات سے ہے یعنی وہ براہ راست اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے متعلق امور ہیں۔ یہ ایسے امور ہیں کہ جن میں اختلافات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ ان مسائل میں انفرادی اجتہاد بھی کفایت کر جاتا ہے بشرطیکہ کسی میں اس کی شروط پوری ہوں۔ دوسری قسم کے مسائل وہ ہیں جو معاملات سے متعلق ہیں۔ ان کے بارے میں مزید گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو باہمی معاملات سے متعلق ہیں۔ ان مسائل میں اختلاف، نظام سے دوری اور عدل سے اجتناب کی طرف لے جاتا ہے، خاص طور پر جبکہ معاشرہ ایک ہی ہو یا ایک ہی جیسے معاشرے ہوں۔ ایسی جگہ میں وہی اجتہاد کوئی علمی فائدہ دیتا ہے جو اجتماعی طور پر ہو یعنی علمائے مجتہدین کی ایک جماعت نئے

[1] الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تطبيقه: ص128

[2] أيضاً: ص129

حوادث میں غور و فکر کرے اور سابقہ علماء کی آراء کی روشنی میں اپنے احوال کے مطابق اجتہادی آراء مستنبط کرے۔"[1]

دسمبر 1989ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا کی طرف سے ہمدرد کنونشن سنٹر، نیو دہلی میں دوسرا فقہی سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار کا صدارتی خطبہ جناب مولانا رفیع عثمانی حفظہ اللہ نے پڑھا، جس کا موضوع 'تغیر پذیر حالات میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت' تھا۔ مولانا اپنے اس خطبے میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت و اہمیت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میرے والد محترم یعنی مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1976ء) فرماتے تھے، ایسے اجتماعی مسائل جو پوری امت کو در پیش ہیں یا ملک کے تمام مسلمانوں کو در پیش ہیں ان میں انفرادی فتاویٰ نہ دیئے جائیں۔ ان میں باہمی مشورہ ضروری ہے۔ اور تمام بزرگوں کا یہی طریقہ رہا ہے۔ چنانچہ پاکستان میں بھی حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1977ء) نے ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جو آج بھی "مجلس تحقیق مسائل حاضرۃ" کے نام سے موجود ہے۔ اس مجلس کی طرف سے کئی ایک رسائل شائع ہوئے' ایک ایک مسئلہ پر بعض اوقات دو دو سال تحقیق ہوتی رہی۔"[2]

ڈاکٹر یوسف القرضاوی حفظہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے کہ عمومی اور عوامی نوعیت کے مسائل میں انفرادی اجتہاد کی بجائے اجتماعی اجتہاد کے طریق کا انتخاب کرنا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جدید مسائل میں ہمیں انفرادی اجتہاد کی بجائے اجتماعی اجتہاد کی طرف منتقل ہونا چاہیے کہ جس میں اہل علم پیش آمدہ مسائل میں باہمی مشاورت سے کوئی فیصلہ جاری کرتے ہیں خصوصاً جبکہ وہ مسئلہ عمومی نوعیت کا ہو اور عامۃ الناس کی اکثریت سے متعلق ہو۔ کسی شخص کا علمی مقام و مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، پھر بھی اجتماعی رائے میں انفرادی رائے کی نسبت صحت کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک شخص کسی موضوع کے ایک پہلو پر غور کرتا ہے جبکہ دوسرا پہلو اس سے اوجھل رہتا ہے۔ بعض اوقات کسی شخص کو کوئی نص یاد ہوتی ہے جبکہ دوسرے کے ذہن میں وہ موجود نہیں ہوتی۔ اسی طرح بعض اوقات مناقشے سے کچھ چھپے ہوئے نقاط بھی سامنے آجاتے ہیں یا پوشیدہ اُمور روشن ہو جاتے ہیں یا بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ یہ تمام شوریٰ اور اجتماعی عمل کی برکات ہیں جو ہمیشہ افراد کے عمل کے بالمقابل ایک جماعت یا ادارے کے عمل میں حاصل ہوتی ہیں۔"[3]

---

[1] الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تطبيقه: ص127-128

[2] جدید فقہی مباحث: 2/ 31-32

[3] الاجتهاد في الشريعة الإسلامية: ص182

اجماع کا حصول

قرآن وسنت کے بعد اجماعِ مجتہدین ایک اہم شرعی دلیل ہے۔ عصر حاضر میں اجماع کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ اجتماعی اجتہاد ہے۔ اجماع کی دو بڑی قسمیں ہیں: ایک اجماع تام کہ جس میں اجماع کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں اور دوسرا اجماع ناقص کہ جس میں اجماع کی بعض شرائط مفقود ہوں۔ اجتماعی اجتہاد ایک اعتبار سے اجماع ناقص ہوتا ہے لیکن اجماع تام کے درجے کو پہنچ سکتا ہے۔ ڈاکٹر توفیق الشاوی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"بعض مفکرین کا کہنا یہ ہے کہ اجتماعی اجتہاد، اجماع تام تک پہنچنے کے لیے ایک پُل کا کام دے سکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جس مسئلے میں علماء کی کوئی اجتماعی رائے سامنے آئے، اسے بقیہ علمائے مجتہدین کے سامنے پیش کیا جائے۔ پس اگر وہ صراحتاً اس کی تائید کر دیں تو یہ اجماع صریح ہو جائے گا اور اگر وہ اس کو جاننے کے بعد اس میں خاموشی اختیار کریں تو یہ اجماع سکوتی ہو گا۔"[1]

استاذ علی حسب اللہ حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ اجتماعی اجتہاد کو اجماع ناقص شمار کر لیا جائے جیسا کہ علماء نے اجماع کی دو قسمیں بیان کی ہیں: اجماع کامل اور اس سے مراد تمام مجتہدین کا اتفاق ہے اور اجماع ناقص کہ جس میں اکثر مجتہدین کا اتفاق ہوتا ہے۔ اس کو بعض اوقات اجتماعی اجتہاد بھی کہہ دیتے ہیں۔ اس رائے کے حاملین کا کہنا یہ ہے کہ اجماع کامل، امر واقعہ میں صرف انہی مسائل میں ثابت شدہ ہے، جو ضروریات دین سے متعلق ہیں اور ان مسائل میں آپ جس بھی عالم دین سے ملیں گے وہ آپ کی موافقت ہی اختیار کرے گا اور اپنے ماقبل والوں سے اس کو نقل کرے گا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اس بات پر اجماع کہ دادا، بھائیوں کی موجودگی میں بھی وارث ہوتا ہے اور یہ کہ دادی کے ساتھ نکاح ماں کی طرح حرام ہے اور اگر ماں نہ ہو تو دادی 6/1 کی وارث ہوتی ہے اور یہ کہ اُم الولد (وہ لونڈی جس سے مالک کی اولاد ہو) کی بیع حرام ہے۔"[2]

بعض علماء نے اجتماعی اجتہاد کو اجماع واقعی کا نام دیا ہے۔ ان علماء کا کہنا یہ ہے کہ اصول فقہ کی اصطلاح میں اجماع تام امر واقعہ میں کبھی بھی واقع نہیں ہوا بلکہ صحابہ کے دور میں بھی جن مسائل پر اجماع کا دعویٰ کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتماعی اجتہاد سے ثابت شدہ مسائل ہیں۔ ڈاکٹر عبد المجید السوسوۃ حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"پس اجماع کی بنیاد یعنی جمیع مجتہدین کا اتفاق تو ناممکن ہے لیکن اکثر مجتہدین کا اتفاق ایک ناممکن امر نہیں ہے۔

---

[1] الشاوي، توفيق، الدكتور، فقه الشورىٰ والاستشارة: ص186، دار الوفاء للطباعة والنشر والتوزيع، المنصوره، الطبعة الأولىٰ، 1412هـ

[2] الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي: ص82

اسی تصور کے بارے میں بعض علماء کا کہنا یہ ہے کہ اصولی اجماع کبھی واقع ہی نہیں ہوا بلکہ درحقیقت اجتماعی اجتہادات کا وقوع ہوا ہے۔ اور جس کو اجماع کا نام دیا گیا ہے وہ اصل میں اجتماعی اجتہاد ہے۔ ان علماء نے اجتماعی اجتہاد کو اجماعِ واقعی کا نام دیا ہے یعنی یہ مختلف اسلامی ادوار میں بالفعل واقع ہوا ہے جبکہ اصولی اجماع عملی طور پر کبھی بھی واقع نہیں ہوا۔ اس رائے کی دلیل یہ بھی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں جن اجماعات کا دعویٰ کیا گیا ہے، وہ درحقیقت اجتماعی اجتہادات تھے، کیونکہ جب بھی خلفاء کو کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہوتا کہ جس میں کتاب و سنت کی کوئی صریح نص موجود نہ ہوتی تو وہ مسلمانوں کے سرداروں، بہترین لوگوں اور علماء کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ کرتے تھے۔ جس رائے پر ان کا یہ مشورہ ختم ہوتا اس کو حکم شرعی تصور کیا جاتا۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اجتماعی اجتہاد تھا۔ کیونکہ اس مشاورت کے لیے جو لوگ جمع ہوتے تھے وہ جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم نہ تھے۔ خلفاء میں سے کسی ایک کے بارے میں یہ مروی نہیں ہے کہ اس نے اس مشاورت میں شریک صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ اور دوسرے شہروں میں موجود بقیہ علماء صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے کی موافقت ہونے تک حکم شرعی میں توقف کیا ہو۔"[1]

اور جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ اجتماعی اجتہاد نہ تو اجماع ہے اور نہ ہی حجت ہے البتہ اجماع کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف القرضاوی حفظہ اللہ نے اجتماعی اجتہاد کے ذریعے اجماع تام کے حصول کی ایک تجویز پیش کی ہے۔ ذیل میں ہم وہ تجویز ان کے الفاظ میں بیان کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اور یہ مطلوب اجتماعی اجتہاد ایک بین الاقوامی علمی اسلامی اکیڈمی کی صورت میں ہونا چاہیے۔ یہ مجلس علاقائی، مذہبی یا قومیتی بنیادوں کی بجائے عالم اسلام کے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل فقہاء پر مشتمل ہو۔ کوئی شخص اس اکیڈمی کی رکنیت کا امیدوار اپنی فقاہت اور تقویٰ کی بنیاد پر ہو سکتا ہے نہ کہ فلاں حکومت یا اس نظام سے تعلق یا فلاں حکمران اور اس نگران سے رشتہ داری۔ یہ ایک ضروری امر کی وجہ سے ہے کہ اس اکیڈمی کو مکمل آزادی حاصل ہو تاکہ یہ مجلس اپنی رائے صراحت سے بیان کرے اور بغیر کسی حکومتی دباؤ یا رعب یا معاشرے کے پریشر سے اپنی قرارداد یں جرات سے پاس کرے۔ اور اگر اس اکیڈمی کے علماء کا اجتہادی مسائل میں سے کسی ایک مسئلے کے بارے میں کسی رائے پر اتفاق ہو جائے تو اس کو عصر حاضر کے مجتہدین کا اجماع کہہ سکتے ہیں۔ یہ اجماع فتوی اور قانون سازی میں حجت ہو گا۔ اگر ان علماء کا آپس میں اختلاف ہو جائے تو جمہور کی رائے راجح ہو گی جب تک راجح قرار دینے کا کوئی دوسرا شرعی سبب موجود نہ ہو۔ اسی طرح یہ اجتماعی اجتہاد، انفرادی اجتہاد پر فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس سے بے نیاز کر سکتا ہے، کیونکہ اجتماعی اجتہاد کا رستہ جن بنیادی تحقیقات کی روشنی میں منور ہوتا ہے، وہ مجتہد افراد کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں تاکہ ان پر اجتماعی مناقشہ ہو سکے۔ انہی انفرادی

[1] الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي: ص 81-82

تحقیقات پر بحث و مکالمے کے بعد اکیڈمی کی اجماعی یا اکثری قرار دادیں پاس ہوتی ہے... اس صورت میں افراد کے پاس اجتہاد کا حق باقی رہے گا بلکہ اجتہادی عمل اپنی ذات میں بنیادی طور پر ایک انفرادی عمل ہے۔ ہماری رائے کے مطابق مجتہدین افراد کی تحقیقات پر باہمی مشاورت کا نام اجتماعی اجتہاد ہے۔"[1]

بعض مسائل جو کہ ملی اور قومی نوعیت کے ہوں کہ ان کا تعلق شورائے عام سے ہو، تو ان میں اگر جمہور کا اتفاق ہو جائے تو اس اتفاق کو رفع نزاع کے لیے اجماع کی سی حجیت دی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر شعبان محمد اسماعیل حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"غالباً وہ جدید مسائل کہ جن میں قرآن وسنت میں کوئی صراحت نہیں ہے، ان میں ایسی دنیاوی مصالح، جو زمان و مکان کے اعتبار سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں، کی وجہ سے رائے دہی کا امکان ہے جیسا کہ کسی شخص کی امامت پر اجماع ہے یا دشمن سے اعلان جنگ پر اتفاق ہے۔ یہ فی الواقع اجتماعی اجتہاد ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور اس اجتماعی اجتہاد کو اجماع جیسی حجیت حاصل ہوتی ہے۔ جلیل القدر علماء کی ایک جماعت کی یہی رائے ہے جیسا کہ امام ابن جریر طبری (متوفیٰ 310ھ)، ابو بکر رازی (متوفیٰ 313ھ)، ابو الحسن خیاط (متوفیٰ 311ھ) رحمہم اللہ، معتزلہ کی ایک جماعت اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔"[2]

شوریٰ کے قرآنی حکم کی تعمیل

قرآن مجید میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف مسائل میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾[3]

"اور اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے مختلف امور میں مشاورت فرمائیں۔"

بعض مفسرین نے اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

«مارأيت أحدا أكثر مشورة لأصحابه من رسول الله ﷺ.»[4]

"میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرتے نہیں دیکھا۔"

بعض ائمہ سلف کی رائے یہ ہے کہ آپ کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشاورت کا جو حکم دیا گیا تھا، اس کے جاری کرنے میں

---

[1] الاجتهاد في الشريعة الإسلامية: ص183-184

[2] الاجتهاد الجماعي وأهميته في مواجهة مشكلات العصر: ص65

[3] سورة آل عمران: 3: 159

[4] الرازي، أبو محمد عبد الرحمن بن محمد، تفسير القرآن العظيم لابن أبي حاتم: 3/801، مكتبة نزار مصطفى الباز، المملكة العربية السعودية، الطبعة الثالثة، 1419هـ

حکمت یہ تھی کہ مابعد کے زمانوں میں آنے والوں کے لیے بطور سنت آپ ﷺ کا یہ فعل جاری ہو جائے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 110ھ) اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"قد علم أنه ليس به إليهم حاجة وربما قال: ليس له إليهم حاجة ولكن أراد أن يستن به من بعده."[1]

"یہ بات معلوم ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورے کی حاجت وضرورت نہ تھی، لیکن آپ ﷺ نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے مابعد والوں کے لیے اس بارے میں کوئی سنت جاری کریں۔"

"ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ (اس آیت کی تفسیر میں وارد تین متنوع اقوال میں سے) سب سے بہتر قول ان مفسرین کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے اپنے نبی ﷺ کو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے، دشمنان اسلام کی ان جنگی چالوں وغیرہ کے بارے میں مشورہ کرنے کا حکم جاری فرمایا کہ جن سے آپ کو سابقہ پڑتا تھا تاکہ اس مشورے سے آپ ﷺ کے وہ ساتھی آپ ﷺ سے الفت محسوس کریں کہ جن کی اسلام کے بارے میں بصیرت اس قدر واضح نہیں تھی کہ وہ اس بصیرت کے ہوتے ہوئے شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہ سکتے۔ اور (اس مشورے کا ایک اور فائدہ یہ بھی تھا) کہ اس مشورے کے عمل سے امت کو ان مختلف مسائل کے پیش آنے اور ان کے حل کے طریقہ کار کے حوالے سے متنبہ کرنا مقصود تھا کہ جو امت کو آپ ﷺ کی وفات کے بعد درپیش آنے والے تھے تاکہ مختلف حوادث کے پیش آنے کے وقت وہ اس فعل (مشاورت) میں آپ ﷺ کی اقتداء کریں اور آپس میں اسی طرح مشورہ کریں جس طرح وہ آپ ﷺ کی زندگی میں آپ کو مشورہ کرتے دیکھتے تھے۔"[2]

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾[3]

"اور آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فیصلے باہمی مشاورت سے طے ہوتے ہیں۔"

ڈاکٹر عبد المجید السوسوۃ حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"اجتماعی اجتہاد میں اجتہادی شوریٰ کی بنیاد پوری ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ فقہی مجلس کے مختلف اراکین آراء کے باہمی تبادلہ، افکار کی چھان پھٹک اور ان کو ہر اعتبار سے پرکھتے ہوئے باہمی مشاورت کی مشق کرتے ہیں یہاں

---

[1] تفسير القرآن العظيم لابن أبي حاتم: 3/801

[2] الطبري، محمد بن جرير، جامع البيان في تأويل القرآن:7/344، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى، 2000م

[3] سورة الشورى:42: 38

تک کہ وہ سب ایک یا ان کی اکثریت ایک رائے پر متفق ہو جائیں۔ اس عمل میں شوریٰ کے اس بنیادی حکم کی تعمیل ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے 'اور ان کے معاملات باہمی مشاورت سے ہوتے ہیں' اور 'اور ان سے معاملات میں مشورہ کریں' میں دیا ہے۔"[1]

حکم شرعی کی تلاش میں صحیح تر رائے کا حصول

اجتہادی مسائل میں خطاء کا امکان برابر باقی رہتا ہے۔ مجتہد جب اجتہاد کرتا ہے تو بعض اوقات اس کا اجتہاد صحیح ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں غلط' اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

"إذا حكم الحاكم فاجتهد ثم أصاب فله أجران وإذا حكم فاجتهد ثم أخطأ فله أجر."[2]

"جب حاکم اجتہاد کرتا ہے اور صحیح رائے تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے لیے دوگنا اجر ہے۔ اور اگر حاکم اجتہاد کرے اور خطا کرے تو اس کے لیے ایک گنا اجر ہے۔"

اجتماعی اجتہاد کی صورت میں اگرچہ خطاء کا امکان ختم تو نہیں ہوتا لیکن کم ضرور ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس میں جمیع مکاتب فکر کے علماء کی نمائندگی موجود ہو۔ یہ امکان ہے کہ انفرادی اجتہاد کی طرح اجتماعی اجتہاد میں بھی غلطی ہو لیکن باہمی مشاورت اور تبادلہ خیال کی صورت میں فقہاء کی جماعت جس رائے تک پہنچتی ہے اس میں صحت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبد المجید السوسوۃ حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"اجتماعی اجتہاد کبار علمائے مجتہدین اور ماہرین فن کے باہمی تعامل، مشارکت اور ایک دوسرے کی تکمیل کے پہلو سے انفرادی اجتہاد سے ایک مختلف شیء ہے، کیونکہ اس میں پیش آمدہ مسئلے کے جمیع پہلوؤں سے واقفیت اور اس کے تمام احوال وجوانب کی سوجھ بوجھ انفرادی اجتہاد کی نسبت بہت زیادہ حاصل ہو جاتی ہے جیسا کہ بحث ومباحثہ کی گہرائی اور آراء ودلائل کی اچھی طرح چھان پھٹک، استنباط حکم میں بہت زیادہ باریکی اور صحت کے امکان پیدا کر دیتی ہے۔"[3]

ڈاکٹر عبد المجید السوسوۃ حفظہ اللہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"عمومی مسائل میں اجتہادی خطاء سے عوام الناس متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان مسائل میں اجتماعی اجتہاد کرنا چاہیے، کیونکہ اس میں بہت باریکی سے تحقیق ہوتی ہے اور مسئلے کے جمیع پہلوؤں پر غور ہوتا ہے اور کسی بھی رائے

---

[1] الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي: ص77-78

[2] البخاري، محمد بن إسماعيل، صحيح البخاري، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب أجر الحاكم إذا اجتهد فأصاب أو أخطا: 7352، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الثانية، 1999م

[3] الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي: ص79

کی خوب چھان پھٹک ہوتی ہے۔ یہ اجتہاد علماء کی ایک جماعت کے تبادلہ خیال اور بحث میں اشتراک کے نتیجے میں نمایاں ہوتا ہے۔ پس اس صورت میں ان کا اجتماعی فیصلہ استنباط میں زیادہ باریکی پر مبنی اور انفرادی اجتہاد کی نسبت صحت کے زیادہ قریب ہو سکتا ہے۔"[1]

علوم میں تخصص اور وسعت

علوم شرعیہ کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: پہلی قسم علوم عالیہ کی ہے جو کتاب و سنت پر مشتمل ہے جبکہ دوسری قسم علوم آلیہ کی ہے یعنی وہ علوم جو کتاب و سنت کے فہم میں معاون کی حیثیت رکھتے ہوں جیسا کہ علم اصول تفسیر، علم اصول فقہ، علم بلاغت، علم صرف و نحو، علم لغت، علم اصول حدیث، علوم قرآن اور علوم حدیث وغیرہ۔ ان علوم میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس قدر تحقیقات، مقالات، کتب، رسائل اور مضامین لکھے گئے ہیں کہ ان کا احاطہ اکیلے فرد کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے عصر حاضر میں ان علوم میں تخصص کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ بعض علماء کا کہنا یہ ہے کہ علوم اسلامیہ میں اس قدر وسعت بھی اجتماعی اجتہاد کا ایک نہایت اہم سبب ہے۔ اجتماعی اجتہاد کی صورت میں ایک فقہی مجلس میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، لغت اور صرف و نحو وغیرہ کے متخصصین مل جل کر غور کریں گے تو تمام علوم کی روشنی میں زیر بحث مسئلے کے جمیع پہلوؤں پر عمدہ تحقیق سامنے آجائے گی۔ ڈاکٹر شعبان محمد اسماعیل حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"عصر حاضر میں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف قسم کے تخصصات کا دور دورہ ہے مثلاً کوئی محقق علم کی ایک شاخ، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ یا لغت وغیرہ میں تخصص کرتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس زمانے میں علماء تمام علوم و معارف کا احاطہ نہیں کر سکتے جیسا کہ سابقہ علماء کا معاملہ تھا۔ پس یہ چیز نادر بلکہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایسا مجتہد یا فقیہ پایا جائے جس میں اجتہاد کی جمیع سابقہ شرائط پائی جارہی ہوں۔ لہٰذا اجتماعی اجتہاد کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ جس میں مختلف تخصصات کے ذریعے اجتہاد کے لیے مشروط تمام علوم کو جمع کر لیا جاتا ہے اور فقہاء آپس میں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کریں۔"[2]

علوم شرعیہ کے علاوہ علوم دنیویہ میں بھی بہت وسعت پیدا ہو گئی لہٰذا فقہ الواقع سے متعلق علوم کا احاطہ بھی کسی اکیلے فرد کے لیے تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر عبد المجید السوسوۃ لکھتے ہیں:

"ہمارے معاصر مسائل میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ متعدد علوم نے ان کو گھیر رکھا ہے اور وہ اس سادہ شکل میں نہیں ہیں جیسا کہ پہلے ہوتے تھے۔ آج ایک مسئلہ ایک سے زائد مثلاً معاشرت، معیشت، سیاست، قانون اور

[1] الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي: ص87

[2] الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تطبيقه: ص120

تربیت وغیرہ سے متعلقہ علوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور اس مسئلے پر صرف ایک علم کی روشنی میں غور وفکر کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک لازمی امر ہے کہ ایسے مسائل میں اس مقدمے سے متعلق تمام علوم کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے۔ اس کام کے لیے ایک جماعت کھڑی ہوگی تو یہ کام ہوگا۔ اگر ایک فرد اس کام کے لیے کھڑا ہو تو ناممکن نہ سہی کم از کم مشکل ضرور ہوگا، کیونکہ اکیلے شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ان علوم شرعیہ سے بھی واقف ہو جو اصولیین نے اجتہاد کی شرائط میں بیان کیے ہیں اور معاصر معاشرے وماحول کی مشکلات کا بھی خصوصی ادراک رکھتا ہو۔ پس اس قسم کے مسائل میں فقہاء کی ایک جماعت کی طرف سے اجتہاد کا یہ فریضہ سرانجام دینا چاہیے۔"[1]

ایک اور مقام پر ڈاکٹر شعبان محمد اسماعیل حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"معاملہ یہ ہے کہ اس زمانے میں علماء تمام علوم ومعارف کا احاطہ نہیں کر سکتے جیسا کہ سابقہ علماء کا طرز عمل تھا۔ کیونکہ ہمارے پچھلے علماء شرعی علوم کے علاوہ طب، الجبرا اور علم فلکیات وغیرہ جیسے علوم انسانی کا بھی ادراک رکھتے تھے۔"[2]

علوم کی وسعتوں کا احاطہ نہ کرنے کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں ہے کہ انفرادی اجتہاد پر مطلقاً پابندی ہی لگا دی جائے بلکہ انفرادی معاملات میں انفرادی اجتہاد پر پھر بھی عمل ہوگا لیکن کچھ مخصوص اور عمومی نوعیت کے مسائل میں اجتماعی اجتہاد ہی کو منہج وطریقہ کار بنایا جائے۔ ڈاکٹر شعبان محمد اسماعیل حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"اجتماعی اجتہاد کی طرف بلانے کا اور اسے انفرادی اجتہاد سے بہتر قرار دینے کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں ہے کہ انفرادی اجتہاد کو سرے ہی سے ختم کر دیا جائے، کیونکہ اجتماعی اجتہاد کا رستہ بھی انفرادی اجتہاد سے ہو کر جاتا ہے اور وہ اس کی بنیاد پر قائم ہے۔"[3]

فقہ اسلامی کی تدوین نو

عصر حاضر میں کتابت کے انداز واسلوب میں نمایاں تبدیلیوں کی وجہ سے فقہ اسلامی کے ذخیرے کو از سر نو ایک نئے، آسان فہم اور جدید اسلوب کے مطابق ترتیب دینے کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ علماء کے علاوہ وکلاء، عوام الناس اور جج حضرات بھی اس فقہی ذخیرے تک رسائی حاصل کر سکیں۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ کسی ایک فرد کے لیے ایسا کرنا تقریباً ناممکن ہے بلکہ علماء، فقہاء اور ماہرین قانون کی ایک جماعت مل کر یہ کام کر سکتی

[1] الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي: ص91

[2] الاجتهاد الجماعي وأهميته في مواجهة مشكلات العصر: ص63-64

[3] الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تطبيقه: ص134-135

ہے۔ڈاکٹر محمود غازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"انیسویں صدی کے وسط تک فقہ اسلامی ایک غیر مدون قانون تھا جس کا میں تفصیل سے تذکرہ کر چکا ہوں۔ اس کی حیثیت انگلستان کے ایک کامن لاء کی سی تھی۔ جو باقاعدہ دفعات کی شکل میں مرتب نہ تھا... یہی کیفیت فقہ اسلامی کی تھی کہ فقہ کی وہ کتابیں، جن میں بعض کا کل میں نے تذکرہ کیا ہے، وہ اور اس طرح کی ہزاروں کتابیں کتب خانوں میں موجود تھیں۔ قاضی صاحبان ان کتابوں سے استفادہ کر کے یہ طے کرتے تھے کہ یہ فتویٰ یا قول یا یہ اجتہاد یہاں اس صورت حال میں متعلق اور (Relative) ہے اور اس معاملہ میں اس کو منطبق کیا جانا چاہیے۔ اس کی بنیاد پر وہ مقدمات کا فیصلہ کر دیا کرتے تھے۔ ان اجتہادات یا فتاویٰ کا حکمرانوں یا حکومتوں سے کوئی تعلق نہیں تھا... یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس سے اہل مغرب مانوس نہیں تھے۔ ان کے تاجر یہ جاننا چاہتے تھے کہ جس قوم اور ملک کے لوگوں سے وہ تجارت کر رہے ہیں اس کے ہاں تجارت کے احکام کیا ہیں۔ اس کی وجہ سے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ یہ قوانین جو ہزاروں کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں جن سے نہ ہر شخص واقف ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہر شخص اس وسیع ذخیرہ کا ماہر ہو سکتا ہے۔ لوگوں کی ضرورت کی خاطر اس کو ایک الگ کتاب کی شکل میں مرتب کیا جائے۔ خاص طور پر مسلمان تاجروں اور ان سے معاملہ کرنے والے غیر مسلم تاجروں کو اس کی ضرورت روز پیش آتی تھی۔"[1]

متنوع فقہی مکاتب فکر کا باہمی ربط و تعلق

انفرادی اجتہاد کی صورت میں ایک مجتہد عموماً دوسرے مکاتب فکر کے علماء کے موقف سے تو کسی حد تک آگاہ ہوتا ہے لیکن اس موقف کی شرعی بنیادیں یا اس کی دلیل کی قوت اس پر اسی صورت واضح ہوتی ہے جب اسے مخالف رائے رکھنے والے علماء سے مل بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ باہمی میل جول سے محبت واخوت کی فضا بڑھتی ہے اور خواہ مخواہ کے سوئے ظن اور الزام تراشیوں میں کمی آتی ہے۔ سلف صالحین اس باہمی ربط کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ اسی اہتمام کا یہ نتیجہ تھا کہ امام شافعی نے امام محمد (متوفی 189ھ) کی اور امام محمد نے امام مالک، امام شافعی نے امام مالک اور امام احمد نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی اختیار کی۔ مولانا محمد زاہد حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"دوسری صدی ہجری میں، اور تیسری صدی کے اوائل میں مختلف مکاتب فکر کے درمیان ربط اور باہمی استفادے کا جو سلسلہ تھا، اس کی کچھ جھلک اوپر کی سطور میں دیکھی جا چکی ہے، اس کے باوجود جہاں جہاں ایک دوسرے کو پورے طور پر سمجھا نہیں گیا، وہاں غلط فہمیاں بلکہ محاذ آرائیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اہل علم پر احسانات شمار کرتے ہوئے کہتے ہیں: "ہم اہل رائے کو برا بھلا کہتے رہے

[1] محاضرات فقہ: ص519

اور وہ ہمیں، یہاں تک کہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ آئے اور انہوں نے ہم دونوں کو جمع کر دیا۔"[1]

آج ذرائع و ابلاغ کی ترقی نے علماء کے اس باہمی رابطے کو آسان کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اس رابطے کا بہت فقدان ہے۔ اجتماعی اجتہاد کی مجالس نے اس خلاء کو پر کرنا شروع کیا ہے۔ اس وقت اجتماعی اجتہاد کے لیے جو فقہی مجالس موجود ہیں' ان کی دو قسمیں ہیں۔ بعض مجالس تو ایک ہی مسلک کے علماء پر مشتمل ہوتی ہیں جیسا کہ "هيئة كبار العلماء السعودية" ہے۔ جبکہ بعض دوسری مجالس میں تمام مکاتب فکر کو متناسب نمائندگی حاصل ہوتی ہے جیسا کہ "مجمع البحوث الاسلامية، الأزهر" ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں ہونے والے فقہی کام سے عدم واقفیت کی صورت میں کسی بھی اسلامی ملک کے علماء اپنے اجتہادات اور فتاویٰ میں کمال اور جان پیدا نہیں کر سکتے۔ مولانا محمد زاہد حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"اجتماعی اجتہاد کی طرف بڑھنے کے لیے پچھلے صفحات میں اس ضرورت کا ذکر کیا گیا ہے کہ پہلے قدم کے طور پر اس اختلافِ منہج وذوق کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور اسے باعث رحمت بھی سمجھا جائے۔ دوسرا قدم اس منزل کی طرف یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہر منہج فکر اور حلقہ فقہ ﴿كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾ کا مصداق بن کر اپنے اپنے خول میں بند رہے، ان کے درمیان ربط و تعلق ہو۔ وہ ایک دوسرے کے فکری و فقہی کام سے واقف ہوں اور اس سے استفادہ کریں، جس طرح اس دور کے فقہاء نے فقہ و افتاء میں کمال و اجتہاد کے لیے دیگر مدارس فقہ کے اقوال سے واقفیت کو ضروری قرار دیا تھا، اسی طرح آج کے علماء و فقہاء کے لیے بھی دیگر مکاتب فکر کی آراء سے واقفیت ضروری ہے۔ عالم اسلام میں ہونے والے فقہی و اجتہادی کاموں اور ان کے نتائج فکر سے آگاہی کے بغیر نہ تو کسی کے فقہی و اجتہادی کام میں کمال و جان پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اجتماعی فقہی کاوشوں کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ آج ذرائع مواصلات کی ترقی نے ایک دوسرے سے استفادے کے اس کام کو آسان بنا دیا ہے۔"[2]

عالم اسلام کے مغرب یعنی مراکش، تیونس، الجزائر، موریطانیہ اور لیبیا وغیرہ میں اس وقت کیا کچھ علمی کام ہو رہا ہے، برصغیر پاک و ہند کے علماء اس سے ناواقف ہیں۔ مدارس دینیہ یا اسلامی جامعات کی لائبریریوں میں شاذ ہی کوئی کتاب ایسی نظر آئے جو بلاد مغرب کے فقہاء و علماء کے علمی کام کا نتیجہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے ہاں سعودی یا مصری علماء کی تحقیقات کتابی صورت میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر و بیشتر عرب ممالک، خلیجی ممالک، براعظم افریقہ کے مسلم ممالک، انڈونیشیا، ملائیشیا اور غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلمان علماء کی تحقیقات سے آج ہم ناواقف ہیں اور اس کی بنیادی وجہ باہمی ربط و تعلق کا فقدان ہے۔ اجتماعی اجتہاد کی صورت میں اس ربط و تعلق کو بڑھاتے ہوئے علمی دنیا میں بہترین اور معتدل نتائج پیدا کیے جا سکتے ہیں۔

---

[1] اجتماعی اجتہاد: تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں: ص14

[2] ایضاً: ص15

تلفیق وجمع بین المذاہب

'تلفیق بین المذاہب' سے مراد ایک مذہب کے ماننے والے علماء کا اپنے مذہب کے فتویٰ کو چھوڑتے ہوئے دوسرے مذہب ومسلک کے فتاویٰ کے مطابق فتویٰ جاری کرنا ہے تاکہ کسی خاص مذہب کے فقہی اقوال میں اگر عوام الناس کے لیے کوئی تنگی کا پہلو ہے تو اس کو رفع کیا جاسکے۔ اگر کوئی عالم دین اپنی انفرادی حیثیت میں اس عمل کو اپنائے تو عموماً اس کے مذہبی حلقے میں اس کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے جس کی وجہ سے بعض علماء نے یہ کام اپنے ممالک میں اجتماعی سطح پر بذریعہ اجتماعی اجتہاد کیا ہے اگرچہ ہمارے نقطہ نظر کے مطابق ایک مجتہد انفرادی حیثیت میں بھی یہ کام کر سکتا ہے۔ مولانا مفتی رفیع عثمانی حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

"حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1943ء) نے ستم رسیدہ عورتوں کی مشکلات کا فقہی حل تلاش کرنے کے لیے متعدد حضرات کو "الحیلة الناجذة" کی ترتیب کے لیے مقرر فرمایا، میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مفتی عبد الکریم گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ ان میں شامل تھے۔ اس میں کئی مسائل میں فقہ مالکی پر فتویٰ دیا گیا، لیکن اس فتویٰ کو شائع نہیں کیا جب تک کہ ہندوستان کے تمام ارباب افتاء سے مراجعت نہیں ہوگئی، اور اصحاب افتاء کی آراء اور تنقیدیں حاصل نہیں ہوگئیں، حرمین شریفین کے فقہاء سے خط وکتابت ہوئی، ان تمام مراحل کے بعد اس کو کتابی شکل میں شائع کرایا۔"[1]

متاخرین کی ایک بڑی جماعت نے 'تلفیق بین المذاہب' کے منہج کو برقرار رکھا ہے۔ اسلامی فقہ اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری مولانا خالد سیف اللہ رحمانی حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

"فقہائے حنفیہ کے یہاں اس سلسلے میں بہت سی نظیریں موجود ہیں۔ شوہر میں بعض عیوب و امراض پیدا ہو جانے کی صورت میں تفریق کا حق، مفقود الخبر کی زوجہ کے لیے تفریق کا حق، تعلیم قرآن اور اذان و امامت پر اجرت، کمیشن ایجنٹ (سمسار) کے کاروبار جیسے کتنے ہی مسائل ہیں جن میں فقہائے متاخرین نے دوسرے مکاتب فقہ کی آراء سے فائدہ اٹھا کر امت کو مشقت سے بچایا اور "اختلاف أمتی رحمتی" کا عملی ثبوت پیش کیا ہے۔"[2]

اسلامی انسائیکلوپیڈیاز کی تیاری

نفاذ اسلام کی طرف پیش قدمی کے لیے عصر حاضر کی بنیادی ضروریات میں ایک اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ ائمہ سلف کی فقہی آراء، اہم شخصیات کا تعارف، تاریخ اسلامی کے اہم واقعات، اسلامی اداروں اور حکومتوں کی

---

[1] جدید فقہی مباحث: 2/31

[2] اجتماعی اجتہاد تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں: ص243

ایک مختصر تاریخ، اسلامی ممالک کا جغرافیہ اور مسلمانوں سے متعلق جمیع معلومات کو انسائیکلوپیڈیاز کی شکل میں مرتب کیا جائے تا کہ اسلامی قانون سازی کے عمل میں پیش رفت ہو سکے۔ ابجدی ترتیب سے تیار شدہ ان موسوعات سے علماء کے علاوہ عوام الناس اور جدید قانون کے ماہرین کا حلقہ بھی استفادہ کر سکے گا۔ اس قسم کے انسائیکلوپیڈیاز کی تیاری کسی ایک عالم دین کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ علماء، فقہاء اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین کی ایک جماعت ہی اس کام کا بیڑا اٹھا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں کئی ایک انسائیکلوپیڈیاز تیار کیے گئے ہیں جن میں اکثر وبیشتر صرف ائمہ سلف کے فقہی اقوال کی اَبجدی ترتیب پر مبنی ہیں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"دنیائے اسلام کے نامور ترین، جید ترین اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے فقیہ استاذ مصطفی اَحمد زرقا نے تجویز پیش کی کہ فقہ اسلامی کے ذخائر اور اصولوں کو ایک انسائیکلوپیڈیا کی شکل میں تیار کیا جائے۔ جس طرح انسائیکلوپیڈیا میں ہوتا ہے کہ جس فن کا انسائیکلوپیڈیا ہوتا ہے اس فن کے تمام تصورات، مباحث اور موضوعات ابجدی ترتیب سے (alphabetical) شکل میں مرتب کیے جاتے ہیں... چنانچہ اس موضوع پر دو انسائیکلوپیڈیاز تیار ہوئے جن میں ایک کی ترتیب میں خود استاذ مصطفی زرقا بھی شامل رہے۔ انہوں نے اس میں بہت کچھ لکھا۔ اس کے مضامین کی ترتیب میں انہوں نے حصہ لیا۔ ان کے کئی شاگرد براہ راست اس کی ترتیب میں شریک تھے۔ یہ ایک بہترین انسائیکلوپیڈیا ہے اور غالباً پینتالیس یا پچاس جلدوں میں مکمل ہوا ہے۔ کویت کی وزارت اوقاف نے "موسوعة الفقه الإسلامی" کے نام سے یہ کام کرایا ہے... ایک دوسرا انسائیکلوپیڈیا اور بھی ہے جو اس درجہ کا تو نہیں لیکن علمی اعتبار سے اچھا ہے۔ یہ مصر میں تیار ہوا۔ اس کا نام بھی "موسوعة الفقه الإسلامی" ہے۔ یہ نو یا دس جلدوں میں ہے۔"[1]

خلاصہ کلام

علمی فکری وحدت کے حصول، مذہبی اور گروہی تعصب میں کمی، فقہ الواقع کے صحیح علم کے حصول، جدید مسائل کی پیچیدگی، اجتماعی اسلامی فقہ کے حصول، فقہ اسلامی کی تدوینِ نو، فقہی مکاتب فکر کے باہمی ربط و تعلق اور اسلامی فقہی انسائیکلوپیڈیاز وغیرہ جیسی مصالح کے حصول کے لیے اجتماعی اجتہاد وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ لیکن اجتماعی اجتہاد کی اہمیت یا اسے رواج دینے کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہونا چاہیے کہ انفرادی اجتہاد مذموم قرار پائے کہ اجتماعی اجتہاد جس بنیاد پر قائم ہے، وہ انفرادی اجتہاد کی بنیاد ہے۔

[1] محاضرات فقہ: ص529